OPEN ACCESS
Al-Qamar
ISSN (Online): 2664-4398
ISSN (Print): 2664-438X
www.alqamarjournal.com

منصور حلاج کے مذہبی و متصوفانہ رخ کی مختلف پرتیں: جمیلہ ہاشمی کے ناول "دشتِ سوس" کا تجزیاتی مطالعہ

Different Layers of *Mansoor Hallaj's* Religious and Mystical Side: An Analytical Study of *Jameela Hashmi's* Novel *"Dasht-e-Soos"*

Dr. Muhammad Rahman
Assistant Professor Urdu, Hazara University Mansehra
Dr. Mutahir Shah
Assistant Professor Urdu, Hazara University Mansehra
Syed Azwar Abbas
Lecturer Urdu, Hazara University Mansehra

Abstract

The history of Urdu novel is incomplete without Jameela Hashmi's Novels. She wrote great novels. Her first novel "Talāsh-e-Baharan" was full of romance. In this novel, she showed the romantic colors of life. She also used famous historical figures as subjects in her novels. These novels include "Chehra Ba Chehra Roo Ba Roo" and "Dasht-e-Soos". In " Chehra Ba Chehra Roo Ba Roo " the circumstances of the famous character Qurat-ul-Ain Tahira are discussed, while in "Dasht-e-Soos" the historical incident of Mansoor Hallāj is analyzed. The present article discusses this historical event regarding Mansoor Hallaāj

Keywords: Jameela Hashmi, Dasht-e-Soos, Mansoor Halaj

تمہید

جمیلہ ہاشمی اردو ناول کی تاریخ میں ایک اہم اضافہ ہیں۔ انھوں نے کئی ایک ناول لکھ کر اردو ادب میں اپنی ایک مخصوص پہچان بنائی۔ اُن کا پہلا ناول "تلاشِ بہاراں" ایک رومانوی ناول ہے جس میں انھوں نے زندگی کے حسین پہلوؤں کا جائزہ لیا ہے۔ ان کا مقصد یہ ہے کہ زندگی جیسی ہے، نہ ہو بلکہ زندگی کو کیسے ہونا چاہیے۔ اس ناول میں فیمنسٹی اپنے انتہا پر نظر آتی ہے۔ بعد میں اُن کے مزید دو ناول "چہرہ بہ چہرہ، روبہ رُو" اور "دشتِ سوس" منظر پر آئے۔ یہ دونوں ناول تاریخی واقعات پر

CC BY

مبنی ہیں۔ "چہرہ بہ چہرہ، رُو بہ رُو" مشہور تاریخی کردار قراۃ العین طاہرہ کے بارے میں لکھا گیا ہے۔ اسی طرح "دشتِ سُوس" ایک اہم اور تاریخی کردار حسین بن حلاج کی زندگی کے واقعات کا احاطہ کرتا ہے۔ اس ناول میں اس شخصیت کے خلاف حکومت کے اقدامات کا ذکر کیا گیا ہے۔ اس ناول میں دسویں صدی عیسویں کے عباسی دور کے حالات کا نقشہ پیش کیا گیا ہے۔ اس ناول کے بارے میں ڈاکٹر سلیم اختر یوں لکھتے ہیں: "جمیلہ ہاشمی نے "دشتِ سُوس" میں منصور حلاج کی شخصیت کو موضوع بنایا ہے۔ انھوں نے ناول میں اس عہد کی فضا کو بہت کامیابی سے زندہ کیا اور ایک مشکل موضوع پر ناول لکھا۔"[1] "دشتِ سُوس" ایک کرداری ناول ہے۔ جس کی کہانی آتش پرست محمی کے پوتے اور نو مسلم منصور کے بیٹے حسین کے گرد گھومتی ہے۔ "چہرہ بہ چہرہ رُو بہ رُو" کی طرح یہ ناول بھی تاریخ کے پس منظر ہی میں لکھا گیا ہے۔ حسین ابن منصور کے مخصوص فکری تناظر کی روشنی میں تحریر کردہ یہ ایک خوب صورت ناول ہے جس میں مصنفہ نے ثابت کیا ہے کہ عشق میں جان دینے کا نام ہی اصل زندگی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے باغیانہ خیالات حکومتِ وقت کی نظر میں کھٹکنے لگے اور اُن کے خلاف رکاوٹیں کھڑی کی جانے لگیں۔ انھوں نے بہت مشکل زندگی گزاری۔ انھیں کبھی بھی زندگی میں سکون سے کام نہیں کرنے دیا گیا۔ ان کے افعال اور اعمال بغاوت کے ذُمرے میں شمار کیے جانے لگے۔ یہی وجہ ہے کہ کئی بار گرفتار کیے گئے۔ اسی دوران انھوں نے عرب جا کر حج کی سعادت بھی حاصل کی اور ہندوستان کا سفر بھی کیا۔

غنائیہ ناول

"دشتِ سُوس" ایک غنائیہ ناول ہے۔ حسین بن منصور ایک مقناطیسی شخصیت کے مالک ہیں۔ یہ ایک غیر معمولی کردار کا انسان تھے۔ قربانی اور شخصیت کی سختی کے آثار اس میں نمایاں تھے۔ وہ ضبط و تحمل اور توبہ و استغفار کی حامل شخصیت تھے یہی وجہ ہے کہ ان کے خیالات غیر روایتی اور شاعری باغیانہ قسم کی تھی۔ منصور نے قرآن مجید کی نئی تفسیر پیش کی۔ لوگ اس کو جادوگر بھی کہتے تھے۔ پہلے وہ سہیل تشتری کے شاگرد تھے۔ بعد میں المکی کے ساتھ داخلہ لیا۔ اس کے بعد جنید بغدادی کے مدرسے میں داخل ہوا لیکن انھوں نے اُسے دیوانہ قرار دے کر نکال دیا۔ وہ عقیدے کے لحاظ سے "وحدت الشہود" کا ماننے والا تھا۔ اسی دوران اُس نے کئی حج کیے۔ اُسی دور میں عرب میں کئی فتنے سر اٹھا رہے تھے اور جگہ جگہ بغاوتیں اٹھ رہی تھیں۔ اس دوران اُس نے "انا الحق" کا نعرہ بلند کیا۔ جس کی وجہ سے اُس کے پیروکاروں کی تعداد بڑھنے لگی۔ اپنی غیر معمولی ذہنی صلاحیتوں کی وجہ سے وہ 9 سال تک قید میں رہے، آخر کار 922ء میں اُسے دجلہ کے کنارے پھانسی دی گئی۔ نویں اور دسویں صدی عیسوی میں بغداد علم و فضل کا ایک بہت بڑا مرکز تھا۔ مختلف استادانِ فن اور فلسفیوں کی وجہ سے مساجد، خانقائیں اور مدرسے آباد تھے۔ یہ فلسفی اپنے شاگردوں کے ساتھ دجلہ کے کنارے باغوں میں تشریف لے جا کر اپنی بحث و مباحثوں کا آغاز کرتے۔ ان مجالس میں ہر مذہب اور ہر عقیدے کے لوگ شامل ہوتے تھے۔ اس دور کی تصویر کشی جمیلہ ہاشمی ان الفاظ میں کرتی ہیں:

> "بنو امیہ کے زمانوں کی بدویت آل عباس کے وقتوں میں جمی جمائی شہری زندگی میں بدلی، مزاج بدلے، سادگی کی جگہ پُرکاری نے لی، عمارتوں میں جاہ و جلال، شان و شوکت اپنے انتہائے کمال کو پہنچے۔ علم و فضل کے بحر ذخار یونان اور روما کے علوم سو لولوئے لالہ سے پُر ہوئے۔ ہیبت و سطوت میں، شرافت و نجابت میں، سخاوت و دولت میں ساری دنیا کم تر تھی اور بغداد اپنے مدرسوں، خانقاہوں، مسجدوں میں پھیلی ہوئی بھول بھلیوں جیسی گلیوں، بازاروں اور شاہراہوں کے سب دنیا کو سمیٹے ہوئے تھا۔۔۔ دربار زندگی کا محور

تھا اور اُس تک رائی مشکل نہ ہونے کے باوجود تقریباً ناممکن تھی۔ جیسے حجابات اندر حجابات دیوار در دیوار احاطے ہوں۔ سیاست کے اپنے اصول ہیں اور انھی کا کھیل تھا کہ عام لوگوں کی پہنچ سے حاکم اور حکم کی رسائی عام لوگوں تک محال ہو۔ تاکہ اصل واقعات کی ناخوش گواریوں کا علم نہ حاکم کو ہو سکے اور نہ ہی عوام اپنی داد رسی تک پہنچیں۔ اگر عام آدمی اپنے حاکم کی محفل میں جا پہنچے اور یا شیخ کہہ کر اُسے مخاطب کر سکے تو پھر وہ لوگ جو واسطہ بننے سے ہی زندہ رہتے ہیں اُن کی جگہ زیرِ آسمان کہاں ہو۔"[2]

پس منظر

خلیفہ مقتدر باللہ کے دورِ خلافت تک آتے آتے بغداد کے حالات انتہائی خراب ہو چکے تھے۔ خزانے سے ایک بڑی رقم نکال لی گئی تھی۔ درباری معاملات خلیفہ کی ماں کے زیرِ اثر تھے۔ اس کے علاوہ مخالفینِ حکومت بھی مستحکم ہو رہے تھے۔ ان میں سب سے بڑا مخالف یہی منصور حلاج تھا۔ حسین روضۂ رسول اور بیت اللہ پر حاضری کے لیے چلا جاتا ہے۔ وہاں وہ عبادات و مراقبوں میں مشغول رہتا ہے۔ لوگ اس سے دعائیں لینے کے لیے آتے ہیں۔ ایک خاتون اس سے ملتی ہے اور ایک بیمار کی درخواستِ دعا کا کہہ کر اسے اپنے ساتھ لے جاتی ہے۔ بیمار اغول ہوتی ہے۔ اغول اسے بتاتی ہے کہ وہ اسے کبھی نہیں بھلا سکی۔ وہ اسے یاد رکھے ہوئے ہے۔ اس نے بیٹے کا نام اس کے نام پہ حسین رکھا ہے۔ اب اس کا آخری وقت قریب ہے۔ اس لیے ملاقات کی ہے۔ اس کے بعد اغول کی موت ہو جاتی ہے اور اسے دشتِ سماویہ میں دفن کر دیا جاتا ہے۔ اور حسین کی دنیا میں محبت کی لو پھر سے بھڑکنے لگ جاتی ہے۔ حسین بغداد میں رہتا ہے۔ اس کے کشف و کرامات کی دھوم مچی ہوئی ہے۔ اس کی شہرت کی وجہ سے کچھ لوگ اسے نقصان پہنچانے کے درپے ہو جاتے ہیں۔ اس کا والد منصور اس کی خبر لیتا رہتا ہے اور اسے نقصان سے بچانے کی کوششیں کرتا رہتا ہے۔ وہ اسے مجبور کر کے واپس اپنے علاقے لے کے جاتا ہے۔ کچھ عرصہ حسین ادھر رہتا ہے۔ پھر والد منصور کے ساتھ مکہ مدینہ کے سفر پر نکلتا ہے۔ منصور روضۂ رسول کی زیارت کر لیتا ہے جب کہ حسین مدینے کے باہر گھومتا رہتا ہے اور باریابی کی اجازت کا منتظر رہتا ہے۔ منصور قافلے کے ساتھ مکہ کی طرف عازمِ سفر ہو جاتا ہے لیکن راستے میں قافلے پر قرمطیوں نے حملہ کیا اور سب مسافروں کو موت کے گھاٹ اتار دیا۔ منصور کا سفر محبت بھی اس جگہ تمام ہوا۔

حسین بن منصور کی کیفیات

حسین مدینہ کے مضافات میں گھومتا رہا۔ وہ عشقِ الٰہی میں اس حد تک ڈوب گیا کہ اسے لگا کہ اس کی ہستی اس کی ہستی میں فنا ہو گئی ہے۔ وہ ذاتِ حق کا حصہ بن گیا تھا۔ ان کے درمیان من و تو کا فاصلہ باقی نہیں رہا تھا۔ اس نے نعرہ لگایا "انا الحق"، کیونکہ حق کے علاوہ وہ اپنے آپ کو فنا کر چکا تھا۔ حال کی یہ کیفیت اس پر پہلی دفعہ طاری ہوئی تھی اور وہ اس کے زیرِ اثر تھا۔ حرمین شریفین کے سفر سے حسن کا نہ دادا واپس آیا اور نہ باپ۔ وہ صبر کر گئے۔ حسین اس سفر کے بعد ہندوستان، چین اور ترکستان کے سفر پر نکلا۔ واپسی پر وہ اپنے گھر گیا۔ اپنے بیٹوں کے درمیان رہا۔ لیکن بغداد میں حامد بن عباس کو اس سے انتقام لینا ہے۔ حامد بن عباس کو اپنی کنیزوں سے پتہ چل گیا کہ اغول زندگی بھر حسین سے محبت کرتی رہی۔ اس کا بیٹا بھی اسی کی وجہ سے حسین کے نام سے موسوم ہوا تھا۔ اس کا بیٹا حسین اپنے باپ کو چھوڑ کر مصر کے فاطمی حکمران عبید اللہ المہدی کا ساتھی بن گیا تھا اور پھر ادھر ہی ایک جنگ میں اس کی موت ہو گئی تھی۔ حامد بن عباس فاطمی حکمرانوں کے خلاف مہم میں ناکام ہو گیا تھا۔ اس جنگ میں اس کی ساری فوج تباہ ہو گئی تھی۔ وہ بمشکل اپنی جان بچا کے لایا تھا۔ اس کا شاندار ماضی کئی شکستوں سے داغ دار ہو گیا تھا۔ بیوی کی محبت

کے حصول میں شکست، اولاد سے محبت کے حصول میں شکست، میدانِ جنگ میں شکست۔ حامد بن عباس ان تمام شکستوں کا ذمہ دار حسین بن منصور حلاج کو سمجھتا تھا۔ وہ اس سے انتقام لینے کی آگ میں پاگل ہو گیا تھا۔ وہ اپنی ہر شکست کا سبب حسین بن منصور کو سمجھنے لگا تھا اور اسے ہر صورت فنا کرنے کے درپے تھا۔ جس کی وجہ سے حامد تنہائی کا شکار تھا۔ حامد مقتدر باللہ کا قریبی وزیر تھا۔ اسی وجہ سے حامد بن عباس کو سب سے زیادہ قریبی رکھا جا رہا تھا۔ حامد کے حالات کے بارے میں خالد اشرف یوں لکھتے ہیں: "حامد بن عباس تنہائی میں کھڑا تھا اور ریگ رواں کے بھنور میں نہایت آہستہ آہستہ ڈوب رہا تھا۔ اُس کی ساری زندگی لایعنی اور لاحاصل ہو چکی تھی۔ عبداللہ المہدی کے ہاتھوں اُٹھائی ہوئی فوجی شکست اور ذلت نے اُس کو مزید دل برداشتہ اور پریشان کر دیا تھا۔ عبداللہ المہدی نہایت درویش صفت، پہاڑوں کا سا حوصلہ رکھنے والا حاکم اس کی فوجوں کے لیے ایک آتش دیوار ثابت ہوا جس سے ٹکرا کر ساری فوج خاک ہو گئی خود حامد نہایت مشکل سے جان بچا کر بغداد کی طرف پلٹا تھا۔"[3] اصل وجہ یہ تھی کہ حامد بن عباس کی بیوی بھی حسین بن منصور کی عاشق تھی اور اُس نے اپنے بیٹے کا نام بھی اسی وجہ سے حسین رکھا تھا۔ اب حامد کو اپنی بیوی چھوڑ چکی تھی جس کی وجہ سے اُس کے دل میں حسین کے خلاف نفرت بھری ہوئی تھی۔ اُس نے دیگر امرا کے اتھ مل کر حسین کے خلاف ایک مکمل محاذ بنایا اور اُس پر کفر کا فتویٰ لگایا۔ اُس نے اُس وقت کے قاضی ابو عمر کو اپنے ساتھ ملایا اور اُس کو دھمکی دی کہ وہ منصور کے خلاف بغاوت کا الزام لگا کر اُس کی پھانسی کے پروانے پر دستخط کر دے۔ حامد بن عباس نے قاضی ابو عمر سے مراسم بڑھائے تاکہ اس سے حسبِ منشا فیصلہ لیا جا سکے۔ اس نے ایک دیوانے حسین کو موت سے ہم کنار کرنے کے لیے مدرسہ نظامیہ کے اساتذہ و فقہا کی دعوت کی۔ اس نے دیگر قاضیوں پر انعام و اکرام کیا تاکہ وہ اس کی اعانت کر سکیں۔

تصوف کی تاریخ میں روشن باب کا اضافہ

حسین بن منصور حلاج اس طرح سے اپنی منزل بغداد واپس پہنچ گیا کیونکہ اس جگہ اس نے تصوف کی تاریخ میں ایک روشن باب کا اضافہ کرنا تھا۔ حامد بن عباس نے حسین کو زندان میں ڈلوا دیا۔ اس نے عدالت لگوائی جس سے اس نے حسین کو واجب الدم ثابت کروانا تھا۔ قاضی ابو عمر کو اس نے عدالت میں گھیرا کہ جو الفاظ اس نے سماعت اور جرح کے دوران کہے ہیں ان سے اب وہ پیچھے نہیں ہٹ سکتا۔ وہ حسین کو گردن زدنی نہیں سمجھتا تھا لیکن حامد بن عباس نے اس کی ایک نہ چلنے دی اور اس سے حسین کو واجب الدم قرار دلوا کے رہا۔ مدرسہ نظامیہ کے فقہا و اساتذہ سے بھی اس فیصلے کی توثیق کروائی۔ اگرچہ خلیفہ مقتدر باللہ کی ماں شغب حسین کی طرف دار تھی۔ وہ حسین سے اپنے بیٹے یعنی خلیفہ وقت کے لیے دعا کرواتی رہتی تھی لیکن حامد بن عباس کی سازش کے سامنے اس نے بھی خود کو بے بس پایا۔ حامد بن عباس نے عدالت سے حسین کو گردن زدنی قرار دلوا دیا تھا لیکن اس سے اس کی تسلی نہیں ہو رہی تھی۔ اس نے فیصلے کی دستاویز میں اضافے کروائے اور حسین کو سنگسار کرنے، ایک ہزار کوڑے لگوانے، مُثلہ کرنے اور پھر گردن مارنے کے فیصلے لکھوائے۔ سزائے موت پر عمل درآمد سے پہلے کی رات حسین کو آقائے رازی اور مادرِ خلیفہ شغب کی طرف سے زندان سے نکلنے اور بغداد چھوڑنے کی پیشکش ہوئی لیکن حسین نے انکار کر دیا۔ حسین نے کہا کہ مجھے بغداد میں رہنے کا حکم ہے۔ میں مقدرات سے بھاگوں گا نہیں بلکہ اس کا سامنا کروں گا۔ جمیلہ ہاشمی لکھتی ہیں: "حسین کہتا رہا "میرے معاملے میں اللہ سے ڈرو۔ میری پشت مضبوط ہے۔ میرا خون بہانا حرام ہے۔"

زردروئے آقارازی اپنا راستہ بناتا ہوا بھیڑ کو دائیں بائیں سے ہٹاتا ہوا ایک بالشت آگے بڑھا تا اسی کے قریب آرہا تھا۔ لوگ یونہی شور مچا رہے تھے۔ "حلال الدم، حلال الدم" ایک طرف سے آواز آرہی تھی۔ "ناجائز، ناجائز محض سُنی ہوئی باتوں اور

مفروضوں پر کوئی قابل گردن زنی نہیں ہوتا۔""خاموش ــــــــ بغداد کا شحنہ دھاڑا۔ سوائے قاضی ابو عمر کے کسی کو کوئی بات کہنے کا اختیار نہیں اور نہ ہی کوئی اس بار در خود اعتنا ہے۔""جو آپ نے کیا ہے، جو آپ نے سوچا تھا، جو فتویٰ آپ نے دیا تھا اُسے لکھ دینے میں کیا قباحت ہے۔ یہ روز روز کا فتنہ مٹے۔ یہ کفر اور الحاد کا داعی، یہ معتزلی، زندیق، قرمطی، فاجر، گمراہ کرنے والا شخص زمین کے سینہ پر بوجھ ہے۔ قاضی ابو عمر ــــــ انا الحق کہنے والا چاہے وہ دیوانگی میں ہی ہوں نہ ہو کہے قابلِ تعزیر ہے۔"[4]
اس حوالے سے ار قرا یوسف اپنے مقالے "جمیلہ ہاشمی بحیثیت تاریخی ناول نگار" میں لکھتی ہیں: "حسین بن منصور حلاج کی سزائے موت کا تماشا دیکھنے کے لیے بغداد کی پوری خلقت امڈ آئی تھی۔ ہر کوئی اسے واجب الدم سمجھتا تھا۔ اس کے نعرۂ انا الحق کو سب دعوائے خدائی سمجھتے تھے۔ انھیں حال اور قال میں فرق روا رکھنے کی سمجھ نہ تھی۔ ہر کوئی اس کا انجام دیکھنے کا منتظر تھا۔ حسین کو میدان میں لایا گیا۔ لوگوں نے اس پر پتھر برسائے وہ مسکراتا رہا۔ اسے حبشی غلام جلاد کے ذریعے ہزار کوڑے لگوائے گئے۔ اسے رات بھر تڑپایا گیا۔ اگلے دن اسے مثلہ کیا گیا۔ پہلے اس کی ٹانگیں کند چھری سے کاٹی گئیں۔ پھر اس کے بازو کاٹے گئے۔ اس کی رگ رگ اور نس نس کو، ریشے ریشے کو کاٹا گیا تا کہ اس کی مثالی اذیت سے حامد بن عباس کی خونی پیاس بجھ سکے۔ بالآخر اس کی گردن اڑا دی گئی۔ اور سب سے آخر میں اس کے اعضا کو ڈھیر کر کے آگ لگا دی گئی۔ اس کی راکھ دجلہ میں بہا دی گئی۔ لیکن عجیب منظر تھا اس کے ہر عضو سے، وہاں کے ہر ذرے سے انا الحق کی صدا نکلتی سنائی دیتی تھی۔"[5] یوں ایک سازش کے تحت اسے پھانسی دی گئی لیکن یہ ایک ایسا ظلم تھا جس کی وجہ سے لوگ اس سے نفرت کرنے لگے۔ حسین کا کردار سب سے الگ تھلگ اور جداگانہ تھا۔ اس کردار کے بارے میں اسلوب انصاری یوں لکھتے ہیں: "حسین بن منصور ناول میں شروع سے آخر تک جس طرح سے پیش کیا گیا ہے وہ ایک مافوق الفطرت مظہر معلوم ہوتا ہے جس کے کردار کی اہم اور نمایاں خصوصیت اپنے آئینہ ادراک میں ان رویائے کا عکس دیکھ لینا ہے جو اس پر منکشف ہوتے رہتے ہیں۔"[6] جب اُس کے ہاتھ کاٹے گئے تو ایک عجیب منظر سامنے تھا۔ ناول نگار کے الفاظ یوں ہیں: "عشق مزرع گلاب ہے۔""عشق مزرع زندگی ہے۔" جنھیں سُن کر شبلی اور عطارد کی روحیں سرمست ہوں گی اور جب ہاتھ کاٹ ڈالے گئے تو کٹے ہوئے ہاتھوں سے خون بہتا دیکھ اس نے اپنے منہ پر مل لیا۔ "آقائے رازی نے کہا "بخدا میں دیوانہ ہو جاؤں گا۔ یہ کیا کر رہے ہو؟""وضو کر رہا ہوں تا کہ نمازِ عشق ادا کر سکوں۔ آقائے رازی! کیا عشق مزرع زندگی نہیں!""حسین کیا تم دیوانے ہو کہ تمھیں جان سے گزرے جانے کا بھی خیال نہیں۔" رازی نے کہا۔ "کیوں نہیں، کیوں نہیں! یہ جان ہی تو تھی جو راہ میں حائل تھی۔ اب میں آزاد ہوں۔ میں اور وہ یوں مل گئے ہیں جیسے شراب پانی میں مل جاتی ہے۔"[7]

نفسیاتی احوال

ناول کے نفسیاتی حوالے بھی قابلِ غور ہیں۔ قاضی ابو عمر کا حسین کے خلاف سزائے موت کا فیصلہ دینا اُسے کسی لمحے چین لینے نہیں دیتا۔ اس نفسیاتی کیفیت کو بھی خوبی کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔ اسی طرح عورت کی نفسیات کے حوالے سے اغول کی وفاداری اور خلیفہ مقتدر باللہ کی ماں شغب کے کردار اہم ہیں۔ یہاں ایک اقتباس پیش کیا جاتا ہے:

> "شغب جس نے اپنی تنہائی اور ناتوانی کو اپنی فہم و فراست سے نظر انداز کر کے اپنے کم سن بچے کو تمام سیاسی رکاوٹیں دور کر کے مسندِ خلافت تک پہنچایا تھا، اب باوجود سیاسی سازشوں اور ریشہ دوانیوں کے ماہروں نے اُس کے بیٹے کو اس سے بد ظن کر دیا تھا۔۔۔ اور وہ ابن منصور کے قتل کے فتوے پر دستخط

کر چکا تھا۔ وہ اُس سلطنت کے گرتے ہوئے گراف کے لیے بہت فکر مند تھی جسے ایک قتلِ ناحق بالکل ہی تباہ کر سکتا تھا۔ یوں ممتا کی نفسیات اور خاص طور پر حامد بن عباس کے حوالے سے رقابت اور سادَیت پسندی کی عکاسی حقیقی انداز میں کی گئی ہے۔"[8]

خلاصۂ بحث

زیر نظر ناول کا اسلوب بے حد شاعرانہ ہے اور غنائی نغمے جیسی کیفیات کا سماں پیش کرتا ہے۔ اس کا مرصع و شاعرانہ اسلوب باکمال ہے۔ جمیلہ ہاشمی کے ہاں استعارات و تشبیہات کا استعمال ملتا ہے۔ اس حوالے سے ممتاز احمد خاں کہتے ہیں: "جمیلہ ہاشمی اپنے مرصع و شاعرانہ اسلوب سے قاری کو بھی کیف و جذب کے عالم میں پہنچا دیتی ہیں۔ پورا ناول اسی اسلوبیاتی کیفیت سے بھرا پڑا ہے۔ لیکن ماجرے کا سفر رکتا نہیں۔ قصے میں بڑی روانی ہے۔ اتفاق سے اس اسلوب کی اصل ابتدا ہمیں کرشن چندر کے یہاں ملتی ہے، لیکن کرشن چندر کے یہاں شاعرانہ اسلوب مدھم کیفیت کا حامل ہے جب کہ جمیلہ ہاشمی کے یہاں فکر و فلسفہ کی حرارت سے یہ اسلوب زیادہ قوت کا حامل بن جاتا ہے۔"[9] مجموعی طور پر کہا جاسکتا ہے کہ دشتِ سُوس جمیلہ ہاشمی کا نمائندہ تاریخی ناول ہے جس میں انھوں نے حق و باطل کی جنگ کا بھرپور نقشہ پیش کرنے کی کوشش کی ہے اور اردو کے تاریخی ناول میں ایک اہم مقام و مرتبہ حاصل کیا ہے۔

References

[1] Dr. Saleem Akhtar, *Urdu Adab kī Mukhtasir Tarīn Tarīkh* (Lahore: Sang-e-Mīl Publications, 2009), 498-499.

[2] Jameelah Hāshmī, *Dasht-e-Soos* (Lahore: A'īnah Adab, 1983), 132.

[3] Dr. Khālid Ashraf, *Brṣagīr mein Urdu Novel* (Dehlī: Educational Publishing House, 1994), 334-335.5

[4] Jameelah Hāshmī, *Dasht-e-Soos*, 461.

[5] Iqrār Yūsaf, *"Jameelah Hāshmī behaisīat-e-Tarīkhī Novel Nigār"*: Maqālah Gheyr Matbū'ah (Mānsehrah: Mamlūkah Shu'ba Urdu, Hazara University, n.d).

[6] Aslūb Ahmed Ansārī, *Urdu key Pandrah Novel* (Lahore: Malik and Company, n.d), 364.

[7] Jameelah Hāshmī, *Dasht-e-Soos*, 489.

[8] Rāheelah Latīf, *Urdu Novel mein māb'ad al-Ṭabī'ātī 'Anāsir: 1947 Kay b'ad (Lahore: Majlis-e-Taraqqi-e-Adab, 2018)*, 327.

[9] Dr. Mumtāz Ahmed khan, *Azādī key bād Urdu Novel "h'eyat, Asālīb aūr Ruhjānāt" 1947-2007 (Karachi: Anjuman-e-Taraqqī-e-Urdu, 1997),* 115.